اردو ترجمہ: محمد جان اخونزادہ

افغان طالبان اور نائن الیون کے تناظر میں

مولانا سمیع الحق کی نئی انگریزی کتاب

TALIBAN : As I see them

پر نومسلم برطانوی صحافیہ مریم سابق یوآنے رڈلے کا تبصرہ

معروف صحافیہ جو افغانستان میں سرحدی خلاف ورزی کی بناء پر طالبان حکومت کی قید میں رہ چکی ہیں،اور بعد میں یہی قید طالبان کے حسن سلوک اور اسلام کے روشن تعلیمات کے باعث حقیقی آزادی یعنی ظلمات سے نور کے سفر کا باعث بنی اور آپ مشرف بہ اسلام ہوکر اِن دنوں مغرب وامریکہ کو اِن کا سیاہ چہرہ مسلسل دِکھا رہی ہیں اور اسلامی تعلیمات اور اس کے روشن چہرے کے نور کو مبلغہ بن کر عام کرنے میں دن رات مصروف ہیں۔حضرت مولانا مدظلہ کی انگریزی زبان میں نئی آنے والی کتاب پر آپ نے انگریزی میں بڑے مؤثر تاثرات راقم کے نام ارسال کئے ہیں جس کا اردو ترجمہ قارئین الحق کی دلچسپی ومعلومات کے لئے دارالعلوم کے فاضل ، باصلاحیت اور مستقبل کے محقق ومصنف مولانا محمد جان نے کیا ہے۔(مدیر)

.....

9/11 کے خوفناک حادثے کے چند روز بعد ہی ستمبر 2001 میں، میں پہلی بار پاکستان آئی۔ ہفتے کے اختتام تک تقریبا تین ہزار دوسرے صحافی بھی افغانستان کے پڑوسی ملک میں اتر چکے تھے۔ غیظ وغضب سے بھرا بش انتظامیہ، جو انتقام پر تلا ہوا تھا، کی طرف سے خوب زور سے جنگ کا ڈنکا بج رہا تھا۔

ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اصل میں ہوا کیا تھا اور امریکہ پر حملہ کیونکر ہوا؟ ہم میں سے بہت سوں کے لیے ایک مسلمان ملک سے یہ پہلا تعارف تھا۔ ہم میں سے بہت سے لوگ طالبان کے بارے سوائے چند بے وقوفانہ جھگڑوں کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہ معلومات بھی ان لوگوں کے ذریعے سے تھیں، جنھیں خود بھی کسی چیز کا علم نہ تھا۔ چند چیزوں کی سمجھ کے سوا، باقی ایک بڑے سطح پر مغربی پروپیگنڈے نے اسلام کی صورت ہماری نظر میں مسخ کردی تھی۔

اس لیے دارالعلوم حقانیہ کو دیکھنا بظاہر ضروری معلوم ہوتا تھا، کیونکہ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے طالبان کے نوے فی صد لوگوں نے تعلیم حاصل کی تھی، اور اسامہ بن لادن اس کے ایک سرپرست کی حیثیت سے مشہور

تھے۔اس دارالعلوم کے مہتمم مولانا سمیع الحق کہلاتے ہیں، لیکن افسوس کہ جس وقت میں وہاں پہنچی، وہ حکومتِ پاکستان کے افسران بالا سے اپنے چند سابقہ طلبہ کے مسائل میں سفارتی حل کی غرض سے، اعلیٰ سطحی مذاکرات کے سلسلے میں دارالعلوم سے باہر تھے۔ اب جبکہ اشاعت سے پہلے مجھے اس کتاب کے پڑھنے کا قیمتی موقع ملا، تو مجھے احساس ہوا کہ مجھے مزید صبر سے کام لے کر مہتمم صاحب کے آنے تک دارالعلوم میں ٹھہرنا چاہیے تھا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا کرنے سے میں افغانستان، طالبان اور اس کے تخیلاتی روحانی لیڈر ملا عمر کے بارے میں بہتر طور پر جان جاتی۔ اس کے ساتھ ساتھ اسامہ بن لادن کے انوکھے پس منظر کو بھی اچھی طرح سمجھ لیتی۔ صبر کی عادت مجھے نہیں، جس کے نتیجے میں مولانا سمیع الحق صاحب سے پھر کبھی ملاقات نہ کر سکی۔ لیکن اب جب مجھے اس کتاب میں ان کی دانش سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا، تو مجھے یقین ہو گیا کہ اگر ہماری ملاقات ہو جاتی، تو چہارگانہ سیاسی صورت حال کا علم بہتر طریقے سے مجھے حاصل ہو جاتا، بجائے اس کے کہ مجھے ہمیشہ اس صحافی کی حیثیت سے یاد کیا جائے، جسے بغیر پاسپورٹ یا ویزہ کے افغانستان میں داخلے پر طالبان نے گرفتار کیا تھا۔

ایک عشرے سے کچھ زیادہ مدت کے بعد، اور معاملے میں بصیرت حاصل کرنے کے بعد، 9/11 کے بعد افغانستان میں جو سامنے آیا، اس کے متعلق ہماری سمجھ بوجھ کافی زیادہ تھی۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ جنگ صرف لاحاصل نہیں تھا، بلکہ لاکھوں لوگوں کو بغیر کسی مقصد کے زندگی سے محروم کیا گیا۔ مجھے پہلے سے زیادہ اس بات کا یقین ہوا کہ یہ ایک ایسا معرکہ تھا، جسے کسی بھی حال میں وقوع پذیر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ ایک ایسا معرکہ تھا جس میں برطانیہ کے سب سے قریب ترین اتحادی نے پوری دنیا میں موجود اپنے بہت سے حامیوں کی اس خیر سگالی سے خود کو محروم کر دیا، جو اسے نائن الیون کے بعد بڑی وافر مقدار میں حاصل ہوئی تھی۔

افسوس ہے کہ ایسے زہریلے بیانات کا سلسلہ آج بھی جاری ہے، جن میں طالبان کے غیر تعلیم یافتہ، بدتہذیب اور ظالم ہونے کا ذکر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا سمیع الحق کی کتاب ان لوگوں کے لیے انتہائی اہم ہے، جو نسل پرستی اور اسلام سے خوف پر مبنی مغرب کے عمومی نقطہ نظر سے مختلف تناظر میں بات سننا چاہتے ہیں۔

مصنف کہتے ہیں کہ اس کتاب کا بیشتر حصہ ان مغربی صحافیوں کے جواب میں لکھا گیا ہے جو 1997 سے 2004 تک دارالعلوم آئے۔ وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے بین الاقوامی میڈیا کے بارے میں اس تاثر کے نتیجے میں یہ کتاب لکھی ہے کہ وہ اسلام اور خطے کی سیاسی وجغرافیائی حقائق سے بالکل ناواقف ہے۔

مجھے شک ہے کہ مغرب کے بہت سارے صحافی یا سیاسی اورفوجی تجزیہ کار، جواپنے ہی پروپیگنڈے کے زیر اثر اندھے ہوچکے ہیں، اس کتاب کے مندرجات سے اتفاق کریں گے، لیکن یہ کتاب طالبان، اسامہ حتی کہ مولانا سمیع الحق کی نگرانی میں چلنے والے بدنام مدرسہ کے دفاع میں نہیں لکھی گئی ہے۔ یہ مولانا سمیع الحق کی طرف سے بطور وضاحت لکھی گئی ہے، ایک ایسی عینک سے جومغرب پر فوکس نہیں کرتی، اورصرف یہی ایک وجہ بھی اس کی اہمیت کے لیے کافی ہے۔

سب سے اہم ترین نکتہ جو یہ کتاب پیش کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ طالبان نے کبھی بھی امریکہ سے جنگ لڑنا نہیں چاہا، اور انھوں نے بار ہا کوشش کی کہ جنگ نہ چھیڑی جائے۔عام طور سے ان واقعات کو تاریخی حوالوں سے مسخ کیا جاتا ہے، لیکن مولانا سمیع الحق ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ طالبان نے امریکہ کو یہ پیش کش کی تھی کہ اسامہ پر افغانستان میں مقدمہ چلایا جائے، اور امریکیوں سے مطالبہ کیا تھا کہ ان کے خلاف شواہد فراہم کریں۔

میں کتاب کے تمام مندرجات سے اتفاق نہیں کرتی، اور مجھے تھوڑی بہت مایوسی بھی ہوئی، جب میں نے یہ پرانا اور گھسا پٹا واقعہ پڑھا کہ نائن الیون کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں کام کرنے کے بجائے یہودیوں نے چھٹی کی تھی ۔ان لوگوں کے ناموں پر ایک سرسری نظر، جو نیو یارک میں مرے تھے، اس واقعے کی تردید کے لیے کافی ہے۔تاہم کتاب ایک انوکھا پس منظر پیش کرتا ہے، جس تک مغربی لکھاریوں کا پہنچنا آسان نہیں، اس لیے کہ مولانا سمیع الحق کی رسائی طالبان کے اندرونی ذرائع سے ان کے انتہائی اہم تاریخی معلومات تک تھی، اور وہ ذاتی طور پر اسامہ کو جانتے بھی تھے۔لیکن میرے لیے اس کتاب کی اہمیت اس حوالے سے ہے کہ یہ مغرب کی نظر میں دنیا کے سب سے بڑے بدنام زمانہ مدرسہ پر فوکس کرتی ہے۔ 1947 میں جامعہ حقانیہ کھولا گیا، اور اپنی نوعیت کا یہ پہلا ادارہ تھا جو مفت اسلامی تعلیم مہیا کررہا تھا۔تیس ہزار سے زائد طلبہ افغانستان سے یہاں آئے، یہاں سے سند فراغت حاصل کی، اور اب ان کی اکثریت طالبان کی قیادت میں شامل ہیں۔مہتمم صاحب اب معاندانہ دام کے شکنجے میں آ گئے۔اسامہ اوراس کے خاندان کے متعلق دلچسپ معلومات کے علاوہ، کتاب ان سوالات کے جوابات بھی فراہم کرتی ہے، جوصحافیوں نے مولانا سمیع الحق صاحب سے اسلام اورخواتین کے معاملات کے بارے میں پوچھے ہیں، اور جواپنی اہمیت کے انتہا پر ہیں۔جب تھکن نہ ہو اوراس کتاب کو اٹھا کر پڑھنے کے بعد آپ اسے رکھیں گے،تو اسلام، طالبان اور افغانستان میں آغازِ جنگ کے ایک مختلف پس منظر کے بارے میں آپ خوب اچھی واقفیت حاصل کر چکے ہوں گے۔کئی حوالوں سے یہ بش اور بلیر کے ان انتہا پسندانہ بیانات کے لیے تریاق بھی ہے، جن کو آج بھی کئی لوگ الاپتے ہیں۔